Date of Publication: 02-11-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 Nov. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 November 2013
Issue: 42, Vol.: 72

۸تا۱۴رنومبر۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر:۴۲،جلد نمبر:۷۲

جب میں 'نیا سفر' رسالہ شائع کرتا تھا تو اسی زمانے میں گجرات کا المناک حادثہ رونما ہوا۔ ایک ترقی پسند ادیب و مدیر ہونے کے ناتے میں اس حادثے کے پیش نظر رسالے کا خصوصی شمارہ شائع کرنا چاہا تو مجھے افسانے اور نظمیں وغیرہ تو ملیں لیکن اس حادثے سے متعلق اردو ادیبوں اور دانش وروں کے مضامین نہیں کے برابر ملے۔ میں نے بعض بزرگ ترقی پسند ادیبوں سے بھی لکھنے کی گزارش کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ زیادہ تر ادیب و دانش ور خاموش ہی رہے۔ کچھ جدید ادیبوں کے نزدیک تو یہ ایک غیر ادبی موضوع تھا، اس پر قلم کیسے اٹھاتے۔ میں نے اپنے اداریے میں اس خاموشی اور بے حسی کا شکوہ بھی کیا۔ ابھی اس اذیت ناک خاموشی کے اسباب و علل پر غور و خوض ہی کررہا تھا کہ انہی دنوں روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' (اردو) میں اردو فکشن کی آبرو کہی جانے والی صف اول کی فن کار و تخلیق کار قرۃ العین حیدر کا ایک انٹرویو پڑھا، انٹرویو لینے والے کا پہلا سوال گجرات سے متعلق تھا جس کا انھوں فورا جواب یوں دیا:

"میں گجرات کے خلاف کچھ نہیں بولوں گی۔ وہ لوگ آکر مجھے جان سے مار دیں گے"۔

انٹرویو لینے والے نے کریدا، اکسایا تو وہ کچھ اور بولیں۔ چند جملے مزید ملاحظہ کیجیے:

"دیکھیے یہ فیز کب تک چلتا ہے۔ یہ پالیٹکس کا معاملہ ہے اگر اچھے لیڈر آجائیں گے تو بدل جائے گا برے آئیں گے تو اور برا ہوگا۔ ہم تو چند لیڈروں کے قبضے میں ہیں۔ اگر پارٹیشن کے بعد یہاں ترقی پسند موومنٹ بڑھ جاتا تو کمیونزم ختم ہو جاتا لیکن وہ نہیں ہوا"۔

یہ جواب تھا ایک خوف زدہ عظیم معمولی شہرت یافتہ ادیبہ کا، گنگا جمنی تہذیب اور صدیوں سے انسانی اور ہندستانی تاریخ و تہذیب پر یقین رکھنے والی اس بڑی ادیبہ کا، عظیم ناول نگار کا۔

اردو کی اس عالمگیر شہرت یافتہ ادیبہ نے ایک نہیں کئی بار اعتراف کیا ہے کہ وہ عصمت چغتائی اور رشید جہاں سے متاثر رہی ہیں، ترقی پسند تحریک سے بھی اثر لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اپنا ایک الگ راستہ بنایا اور فکر و خیال، تخلیق و تعمیر کی ایک نئی دنیا آباد کی، انفرادیت کے جھنڈے گاڑے۔ انفرادیت کی راہ اپنانا بے حد اہم بات ہے لیکن پوری تہذیبی، سماجی اور سیاسی قدروں کی تبدیلی، الٹ پھیر، تقلیب و تخریب اور اس کا ادراک و عرفان ایک دوسری اہم اور سنگین بات ہے۔ جزار عظمتوں کا تاج پہننے والی اردو کی اس

کون اس عہد میں سچ بولے گا؟

پروفیسر علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو، الہ آباد یونی ورسٹی، الہ آباد)

مایہ ناز ادیبہ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ "ہم چند لیڈروں کے قبضے میں ہیں"۔ کیا عصمت چغتائی اور رشید جہاں اتنی ہی آسانی سے اپنے آپ کو لیڈروں کے حوالے کر دیتیں۔ کیا مخدوم، سردار، کیفی وغیرہ اسی طرح خاموش رہتے اور اتنی سیدھی قرات سے پر تحریر و تقریر پیش کرتے۔ کیفی اعظمی بیمار ضرور تھے لیکن ایک خیال کے مطابق گجرات کے حادثے نے انھیں موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ ترقی پسند تو تھے ساتھ ہی ہوش مند اور جرأت مند بھی تھے۔ ادب اور ادیب کی سماجی ذمہ داریوں سے نہ صرف واقف بلکہ عمل پیرا۔ ساری زندگی ترقی پسند تحریک سے الگ تھلگ بلکہ بعض اوقات اس کا مذاق اڑانے والی عینی صاحبہ یہ کہہ رہی ہیں کہ اگر ترقی پسند موومنٹ بڑھ گیا ہوتا تو کمیونزم ختم ہو جاتا لیکن وہ نہیں ہوا۔ کمیونزم ختم کیوں نہیں ہوا۔ برائیاں دنیا سے ختم کیوں نہیں ہو رہی ہیں۔ انسانی تہذیب و تاریخ کا دامن خون سے کیوں لت پت ہے، یہ ایک انسانی اور عرفانی مسئلہ ہے جس پر بزرگوں نے خوب خوب غور کیا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے پھر بھی طاقت اور ناطاقتی، امیری اور غریبی، اکثریت اور اقلیت کا یہ تصادم کل بھی تھا اور آج تو اس نے فسطائیت کی شکل اختیار کرکے بے شرم و بے رحم ہو گیا ہے، مظفر نگر جس کی تازہ ترین مثال ہے۔

بدنصیب و بدترین ہے وہ معاشرہ ہے جو سیاست دانوں کے قبضے میں ہو اور وہاں کے شاعر و ادیب بے وقعت اور بے حس ہو گئے ہوں۔ آج سے تقریباً اسی سال قبل پریم چند نے اپنے یادگار خطبے میں لازوال بات کہی تھی: "ادب سیاست کے آگے آگے چلنے والی مشعل ہے" اور جب انھوں نے اس مشعل کی روشنی تیز کی اور گاؤں دیہات تک کو منور کر دیا تو ادب اور سماج کے رشتوں پر ایک نئی بحث چل پڑی۔ نظریۂ ادب اور مقصد ادب کے سامنے سوالیہ نشان لگایا گیا بلکہ مذاق اڑایا گیا۔ زندگی کی عظمت اور حقیقت بھی زد میں آئی۔ دنیا کے بڑے سے بڑے ادیب و دانش ور اس حقیقت کا جو بھی نام دیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ حقیقت و صداقت، ارضیت و ثقافت کی اپنی مخصوص جمالیات ہوا کرتی ہے۔ ہم اسی کے زیر اثر ہیں اور زیر دام بھی۔

آج ہم ایک بار پھر ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں کہ ادب اور ادیب کے منصب اور ذمہ داریوں اور ادب کے سماجی رول کے بارے میں بہت کچھ سوچا جا رہا ہے۔ تازہ بہ تازہ نو بہ نو علوم و افکار، اقتدار کی جنگ اور صارفین کی اس ریل پیل میں ہم اقدار و افکار کی بیخ پر کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس ترقی، تبدیلی، شکست و ریخت کے حوالے سفر میں حضرت انسان جو دنیا کی تمام تخلیق و تعمیر کا مرکز و محور ہے، اپنی اشرفیت اور حرمت کو کلیجے سے لگائے چپکے سے رخصت ہو گیا جس کے بارے میں کبھی اقبال نے کہا تھا:

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

یہ بات تو حضرت انسان کے لیے کہی گئی ہے لیکن ادیب و دانش ور تو اس سے بھی بلند و بالا شے ہے، تو سوال یہ ہے کہ انسانی حیات کے اس گرم گرم سفر، زندگی کی جد و جہد، اقتدار کی کشاکش اور ظلم و ستم کے سیاہ ماحول میں ادیب و دانش ور کا رول کیا ہے۔ اس کی ذمہ داری کیا ہے یا پھر یوں کہ ادیب کا سماجی منصب اور اس کی سماجی وابستگی کیا ہے۔ وہ بھی اسی انسانی معاشرے کا فرد ہے یا الگ تھلگ ایک خاموش تماشائی۔ وہ بھی اسی ظلم و ستم کا حصہ ہے یا اس سے مبرا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:
"وہ لوگ جو زندگی میں تخلیقی کام کرتے ہیں، وہ کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ معاشرہ سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو۔ جب تک اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں سے محبت جنون کی حد تک نہ ہو۔ وہ تمام المیے، واقعات، حادثات وغیرہ جو اس دنیا میں اور اس کے معاشرے میں ہو رہے ہیں ان سے وہ کیسے آنکھیں چرا سکتا ہے۔ ان کو دیکھنا اور اپنے اندر اتارنا اور ان کا اظہار کرنا ہی فن ہے اور یہی اس کی سماجی ذمہ داری"۔

(ادیب کی سماجی ذمہ داری)

سپاہی اور قلم کار کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ایک جگہ مارکس نے بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کہی ہیں حالاں کہ انھوں نے بے عمل ادیب کو ایک بانجھ عورت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سارتر نے یہاں تک کہہ دیا "اگر ہم نے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا ہے تو ہم میں ہر شخص ادب کے سامنے جواب دہ ہے"۔

پُرانی بحثوں اور زیادہ مثالوں میں اُلجھے بغیر یہ بات تو تقریباً ہر ذمہ دار مکتب فکر کے دانش وروں نے مانی ہے کہ ادیب کسی بھی طرح سماجی حالات، معاشرتی اتار چڑھاؤ اور دنیا میں ہونے والے حادثات سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔

گزشتہ برسوں میں جو زبردست تبدیلیاں آئی ہیں اس سے ہم کم و بیش واقف ہیں، آج دنیا سمٹ سی گئی ہے، دنیا کے کسی کونے میں ہونے والا حادثہ اس کنکر کی طرح ہوتا ہے جسے کسی تالاب میں پھینک دیا گیا ہو۔ تجربے و حادثے تیز تر اور تہ دار ہیں، ہم جتنی آسانی کا شکار ہیں اتنے ہی خوف کا بھی۔ آج ہمارے سامنے وہ حقائق نہیں ہیں جو پریم چند کے سامنے تھے۔ ٹھیک ویسے بھی نہیں جیسے تقسیم اور فسادات کے وقت تھے۔ آج ہماری زندگی وہ نہیں ہے جو کل تھی۔ آج کے فسادات بھی وہ نہیں ہیں جو کل تھے۔ فرقہ واریت، فسطائیت میں بدل چکی ہے۔ بازارواد نے انسان کو انسان نہیں رکھا بلکہ نفع و نقصان کی ایک شے بنادیا۔ قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ انسانیت کا زوال ہو چکا ہے تو ایسے میں ادب اور ادیب کا رول کیا ہے۔ کیا وہ بھی اس مشینری کا حصہ بن جائے۔ فائدہ اور نقصان کا سلسلہ یا کچھ اور — اس چکاچوند، شور و غل میں وہ ایسا کیا کرے جس سے ادب کی انفرادیت و افادیت قائم رہے۔ اقبال نے بہت پہلے کہا تھا:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

نظر سے مراد یہاں نظریہ ہے، انسان اور انسانیت سے متعلق ادیب کا نظریہ — حالاں کہ صرف خبر اور نظر سے بھی اچھا ادب نہیں لکھا جا سکتا اس لیے کہ ایک سچا اور دردمند ادیب تمام واقعات و حادثات کو محض علم و اطلاع کے طور پر نہیں لیتا بلکہ جذبات و احساسات کی سطح پر اس کی باطن کی شخصیت بے چین ہو اٹھتی ہے۔ اس بے چینی کو وہ اپنے شعور و وجدان

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

گاہے گاہے باز خواں

ہندی اور اردو کا مستقبل

منشی پریم چند کی ایک تقریر

عظیم افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند کی یہ تقریر 'ہندی اور اردو کا مستقبل' اردو، ہندی اور ہندستانی کے تناظر میں ہے جو 'اردو' جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ چوں کہ یہ تحریر بہت ہی اہم موضوع کو محیط ہے، اس لیے، اسے یہاں 'گاہے گاہے باز خواں' کے طور پر نقل کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

میں یہاں ہندی زبان کی اُٹھان اور اُبھار کی داستان نہیں سنانا چاہتا۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں موجود ہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج یہ پندرہ سولہ کروڑ ہندستانیوں کی زبان ہے۔ البتہ یہ دو رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے اور اسی اعتبار سے اسے کہیں ہندی اور کہیں اردو لکھتے ہیں، لیکن دراصل یہ ہے ایک۔ بول چال میں ان میں فی الواقع کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن ادب میں تمیز ضرور بڑھ جاتی ہے، مگر یہ امتیاز ہندی کے لیے مخصوص نہیں۔ گجراتی، بنگالی اور مرہٹی وغیرہ زبانوں میں بھی کم و بیش ایسا ہی فرق پایا جاتا ہے۔ ہر زبان کے ارتقا میں وقتی تمدن کو بھی دخل ہوتا ہے اور تمدنی اختلاف کی وجہ سے زبانوں میں بھی بال پڑنے لگتا ہے۔ ہم لوگ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ صوبۂ دلی کی زبان ہے، اسی طرح جیسے برج بھاکھا، اودھی، میتھلی، بھوج پوری اور مارواڑی وغیرہ مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں اور ان سب کو بھی ادبی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا۔ برلی کی مہذب شکل زبان ہے۔ سب سے زیادہ اثر برج بھاکھا کا ہوا، کیوں کہ وہ صوبۂ آگرہ اور بندیل کھنڈ کی زبان ہے۔ اودھی اودھ میں بولی جاتی ہے۔ بھوج پوری پوربی یوپی میں بولی جاتی ہے اور میتھلی بہار کے بعض اضلاع میں۔ برج بھاکھا کی شاعری ہندی ادب کی جان ہے۔ اودھی تصانیف میں تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت بہت مقبول ہوئیں۔ غرض کہ ادب میں برج بھاکھا اور اودھی کا استعمال زیادہ ہوا۔ ہندی کے ابتدائی دور میں برج بھاکھا کو خاص فوقیت حاصل تھی اور صرف بنارس ہی نہیں بلکہ گیا (بہار) تک کے شعرا اسی زبان میں شعر کہتے تھے۔

بعد ازاں یک بیک ان مقامی بولیوں کا تختہ اُلٹ گیا اور ہندی نے ان سب کا نمبر چھین لیا۔ برج بھاکھا کو اب بھی تھوڑے سے لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں ورنہ اور دوسری بولیوں کو ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ہندی کو یہ امتیاز مسلمانوں نے بخشا تھا۔ صوبۂ دلی کی اس بولی کو مسلمانوں نے ہی نوازا، اسے سنوار نکھار کر دربار کی زبان بنایا اور ان کے امرا اور سپاہی جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ انھی کے ساتھ یہ دکن پہنچی اور وہیں اس نے اپنا بچپن گزارا۔ دلی میں عرصہ دراز تک افراتفری رہی اور اس زبان کو ترقی کا موقع نہ ملا۔ لیکن دکن میں یہ پھولتی پھلتی رہی۔ گول کنڈہ، بیجاپور وغیرہ کے درباروں میں یہ پروان چڑھتی رہی۔ مسلمان سلاطین بالعموم ادب کے رسیا ہوتے تھے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر وغیرہ کو ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ دکن کے بادشاہوں میں بیشتر سخن گو اور سخن سنج تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ہندی کا بابا آدم امیر خسرو ہے جو خلجیوں کا ہم عصر تھا۔

مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی۔ ایک ناگری خط میں ٹھیٹھ ہندی جسے بھاکھا یا ناگری کہتے تھے۔ دوسری اردو یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا۔ ہندی زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۰۳ سے پہلے کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کتاب کا نام 'چندراوتی' ہے، اور اسے سدل مسرا نے لکھا تھا۔ اس کے بعد ہی للوجی لال، انشاء اللہ خاں وغیرہ کا نام آتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ سوا سو سال پہلے جس زبان کے نثر کا پتا نہیں چلتا وہ آج ہندستان کی قومی زبان بن رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر اسے یہ درجہ ہرگز نہ مل سکتا تھا۔

زبان کی خلیج

ہندوؤں کی خاصی تعداد اب تک اردو پڑھتی ہے لیکن یہ تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے ہندی سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ شمالی ہند میں آئندہ ہندی اور اردو دو زبانیں رہیں گی اور وہ اپنے اپنے تمدن کے سائے میں دو مختلف راستوں پر چلتی رہیں گی اور ان میں اتحاد کی کوشش بے سود اور بے کار ہے؟ یا یہ ممکن ہے کہ ان دونوں زبانوں کو اس قدر قریب لے آیا جائے کہ ان میں رسم خط کے علاوہ کوئی فرق نہ رہے۔

اس اندھیر نگری میں اب بھی تھوڑے سے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ ان میں گنگا جمنا کا پریاگ بھی مل سکتا ہے اور ان میں یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا کی طرح ہے۔ یہ لوگ ہندی اور اردو ناموں کا استعمال نہیں کرتے کیوں کہ اس سے دونوں کی خلیج بڑھتی ہی جائے گی۔ یہ لوگ دونوں کو 'ہندستانی' کہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ حتی الامکان لکھی جانے والی زبان اور بول چال کی زبان کی صورت ایک ہو اور وہ مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان نہ ہو کر تمام قوم کی زبان ہو۔ جو کچھ لکھا جائے اس سے عوام بھی بہرہ مند ہو سکیں اور ہمارے ملک میں علم پرور طبقے کی جو ایک الگ جماعت قائم ہو رہی ہے اور عوام سے دور ہٹتی جاتی ہے وہ عوام سے قریب تر ہو جائے اور علما و جہلا میں ایسا رشتہ پیدا ہو جائے جس سے قوم میں تازگی اور طاقت پیدا ہو۔

چوں کہ اردو زبان عرصے سے عدالتوں اور شریفوں کی واحد زبان رہی

ہے، لہٰذا اس میں عربی و فارسی کے ہزاروں الفاظ اس طریقے سے گھل مل گئے ہیں کہ دیہاتی بھی انھیں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ان الفاظ کو بلا ارادہ ہندی سے نکالنے کی کوشش کو ہم قوم و ملک کے ساتھ بے انصافی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہندی سنسکرت یا انگریزی کے جو کثرت سے ہوئے الفاظ اردو میں گھل مل گئے ہیں انھیں متروک کرنے اور ان کی جگہ ان کو عربی، فارسی ترکیبوں کو رائج کرنے کی کوشش بھی غیر مستحسن ہے۔ دونوں طرف سے اس کھینچا تانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جنتا سے الگ ہوتا جارہا ہے اور اسے اس کی مطلق خبر نہیں کہ عوام اپنے جذبات و خیالات کو کس طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ ایسی زبان جس کے لکھنے اور سمجھنے والے لوگ تھوڑے سے ہوں یقیناً بے جان، مصنوعی اور بوجھل ہوگی۔ اس میں وہ قوت کہاں سے آئے گی جو عوام کے نبض پر ہاتھ رکھ سکے۔ وہ اس تالاب کی طرح ہے جس کے گھاٹ سنگ مرمر کے ہوں جس میں کنول کھلے ہوں لیکن پانی کے لیے نکاس اور بہاؤ کا راستہ نہ ہو۔ قوم کی زبان وہ ہے جسے قوم سمجھے، جس میں قوم کی روح ہو اور اس کے جذبات ہوں۔ اگر تعلیم یافتہ طبقے کی زبان قومی زبان ہے تو کیوں نہ ہم انگریزی کو قومی زبان بنائیں، کیوں کہ میرا تجربہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات جس بے تکلفی سے انگریزی لکھ پڑھ سکتے ہیں اس روانی سے نہ ہندی یا اردو لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ بڑے بڑے دفتروں اور اونچے طبقوں میں برسوں ہندی یا اردو بولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خانساماں اور خدمت گار بھی ایسے رکھے جاتے ہیں جو انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ہندی اردو اور ہندستانی کا جھگڑا ہی نہیں رہتا۔ وہ اتنی بلندی پر رہتے ہیں کہ دنیا کی گرد ان تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ وہ معلق ہوا میں لٹکے رہتے ہیں، لیکن ہم غریب لاکھ پَر ماریں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہمیں تو اسی گرد و باد میں جینا ہے۔

یہ یاد رکھو کہ غذا کی قوت کا مخزن عوام الناس ہیں۔ ان سے الگ رہنے کی صرف یہ صورت ہے کہ ان پر حکومت کی جائے۔ لیکن عوام اور حاکم یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ عوام میں رہنا ہے تو ان کے خادم بن کر رہو۔ ایسے اہل علم کی آواز عوام کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ وہ آپ اپنے نمائندے ہیں۔ عوام کی نمائندگی سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

ہندستانی

یو پی کے ایک سابق گورنر سر ولیم میرس نے ہندستانی اکیڈمی کے افتتاح کے موقعے پر ہندی اور اردو کے مصنفوں کو جو مشورہ دیا تھا اسے دھیان میں رکھنے کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس وقت تھی، شاید اور زیادہ انھوں نے کہا تھا کہ اردو لکھنے والوں کو یہ سمجھ کر لکھنا چاہیے کہ ان کی چیزیں ہندو پڑھیں گے اور اسی طرح ہندی لکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے ناظر مسلمان ہیں۔

یہ ایک سنہری مشورہ ہے۔ کاش ہم اسے اپنے دلوں پر نقش کرلیں تو زبان کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائے۔ میرے مسلمان دوست مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں وہ ہندو مصنفوں سے زیادہ خطاوار ہیں۔ مثلاً یو پی کی کامن لنگویج ریڈروں کو دیکھیے آپ سہل قسم کی اردو پائیں گے۔ ہندی کی ادبی کتابوں میں عربی و فارسی کے صدہا الفاظ مل جائیں گے لیکن اردو ادب روز بہ روز فارسیت کی طرف زیادہ مائل ہوتا جاتا ہے....

جب تک دونوں زبانوں کا میل نہ ہوگا ہندستانی زبان کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ ساری کرامات فورٹ ولیم کالج کی ہے جس نے ایک زبان کے دو ٹکڑے کردیے۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ کسی سیاسی مقصد کی وجہ سے ایسا ہوا یا اسی وقت یہ زبانیں الگ الگ ہوگئی تھیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جن ہاتھوں نے ہماری زبان کے دو ٹکڑے کردیے انھوں نے ہماری قومی زندگی کے بھی دو ٹکڑے کردیے۔

اپنے ہندو دوستوں سے بھی میری درخواست ہے کہ جن الفاظ نے عوام میں اپنی جگہ بنالی ہے، انھیں نکالنے کے لیے سنسکرت لغت کی طرف رجوع ہونا معتبر ہے۔ 'موجود' کے لیے 'اپستھت'، 'ارادہ' کے لیے 'سنکلپ'، 'بغاوتی' کے لیے 'کرتر' کو کام میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح مستعمل الفاظ کے اصلی سنسکرت ماخذوں کی تلاش بھی بے معنی ہے۔

ہندستانی کو رائج کرنے کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ میٹرک تک ہندی اور اردو دونوں کی تعلیم سب کے لیے لازمی قرار دی جائے۔ اس طرح ہندوؤں کو اردو میں اور مسلمانوں کو ہندی میں کافی مہارت ہوجائے گی اور باہمی بدگمانیوں کا سدّ باب ہوجائے گا۔ چوں کہ تعلیم کا محکمہ دیسی منسٹروں کے ہاتھ میں ہے اور نصاب میں اس تبدیلی سے زائد خرچ نہ ہوگا اس لیے اگر ہندو اور مسلمان دونوں کا متحدہ مطالبہ ہو تو حکومت کو کوئی انکار نہ ہوگا۔

ادیب کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں ترقی کرنے کا موقع دے۔ ادیب ازلی حسن پرست ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حسن کو ڈھونڈتا ہے، لیکن حسن وہیں ہے جہاں ہم آہنگی ہے، وہیں حقیقت بھی ہے۔ حسن وہ شے ہے جو زندگی کو ترقی دیتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔ دراصل یہ ہماری روح کا لباس ہے۔ اگر ہماری روح صحت مند ہوتی ہے تو وہ بے اختیار حسن کی طرف دوڑتی ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ نفاق اور حسد، بدگمانی اور کشمکش، ہماری زندگی کے لیے مہلک ہیں اور اس وجہ سے مکروہ ہیں؟ ادب نے ہمیشہ ان برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے لیے جتنی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، ادب نے ان کے لیے صرف زمین ہی تیار نہیں کی بلکہ ان کی تخم ریزی اور آبیاری بھی کی۔ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی چیز نہیں اس کے آگے آگے چلنے والا نشان بردار ہے۔ ادب اس بغاوت کا نام ہے جو انسان کے دل میں ظلم، بے انصافی اور غرض پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ادیب اپنے خوب صورت پیرایے میں اسی بغاوت کی ترجمانی کرتا ہے۔ دوسروں کے دلوں میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل دہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتے۔ ادیب ان زخموں کی گہرائی کو اس طریقے سے ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اٹھتے ہیں۔

ادیب کے فرائض

ادیب کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں ترقی کرنے کا موقع دے۔ ادیب ازلی حسن پرست ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حسن کو ڈھونڈتا ہے، لیکن حسن وہیں ہے جہاں ہم آہنگی ہے، وہیں حقیقت بھی ہے۔ حسن وہ شے ہے جو زندگی کو ترقی دیتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔ دراصل یہ ہماری روح کا لباس ہے۔ اگر ہماری روح صحت مند ہوتی ہے تو وہ بے اختیار حسن کی طرف دوڑتی ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ نفاق اور حسد، بدگمانی اور کشمکش، ہماری زندگی کے لیے مہلک ہیں اور اس وجہ سے مکروہ ہیں؟ ادب نے ہمیشہ ان برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے لیے جتنی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، ادب نے ان کے لیے صرف زمین ہی تیار نہیں کی بلکہ ان کی تخم ریزی اور آبیاری بھی کی۔ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی چیز نہیں اس کے آگے آگے چلنے والا نشان بردار ہے۔ ادب اس بغاوت کا نام ہے جو انسان کے دل میں ظلم، بے انصافی اور غرض پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ادیب اپنے خوب صورت پیرایے میں اسی بغاوت کی ترجمانی کرتا ہے۔ دوسروں کے دلوں میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل دہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتے۔ ادیب ان زخموں کی گہرائی کو اس طریقے سے ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اٹھتے ہیں۔

کسی نے 'رومارولاں' سے پوچھا تھا کہ "آپ کن کے لیے لکھتے ہیں؟" اس کا جواب یہ مشہور عالم مصنف ان الفاظ میں دیتا ہے: "میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو بڑھتی ہوئی فوج کے پیشوا ہیں۔ میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو اس بین اقوامی جنگ میں شریک ہیں جس میں فتح یاب ہونے کے بعد ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں نہ اونچ نیچ کا فرق ہوگا اور نہ جغرافی حدود ہوں گی۔ ہم جو ادیب ہیں پچھڑی قوموں سے کہتے ہیں کہ بڑھتے چلو لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کرتے۔ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ دوڑ کر ہمارے پاس آئیں۔ چڑھتا ہوا دریا کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

ادب بدگمانیوں کو مٹانے والی چیز ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ادب سے زیادہ آشنا ہوں تو ممکن ہے کہ وہ زندگی میں بھی ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوجائیں۔ ادب میں ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان اور نہ عیسائی، ہم انسان ہیں اور ہم میں صرف انسانیت کا رشتہ ہے۔ کیا یہ شرم کا مقام نہیں کہ ہم ایک ہزار سال سے ایک ہی ملک میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور پھر بھی ایک دوسرے کے ادب سے بے خبر ہیں؟ یورپین مصنفوں کو دیکھیے، انھوں نے ہندستان سے متعلق ہر مضمون کی تحقیق کی اور وہ ہمیں جتنا جانتے ہیں ہم خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے۔ اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے ناآشنا ہونے ہی میں خوش ہیں۔ ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری انسانیت کی اصلاح کرتا ہے یعنی ہم میں ہمدردی اور رواداری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ جس ہندو نے معرکۂ کربلا کی تاریخ پڑھی ہے ناممکن ہے کہ اس کا دل نہ پسیج جائے۔ جس مسلمان نے 'رامائن' پڑھی وہ یقیناً ہندو سے ہمدردی کرنے لگے گا۔ کم از کم شمالی ہند میں ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو اپنے کو نیم جاہل سمجھنا چاہیے جو ہندو ادب سے ناآشنا ہے اور اگر ہندو ہے تو مسلم ادب سے ناواقف ہے۔ دونوں کے لیے دونوں زبانوں اور دونوں رسم الخطوں کا علم لازمی ہے۔ جب ہم زندگی کے چندہ سال انگریزی کے لیے قربان کرسکتے ہیں تو کیا ماہ دو ماہ اس رسم الخط اور ادب کے لیے نہیں دے سکتے جس پر ہماری قومی ترقی کا ہی نہیں بلکہ قومی زندگی کا بھی انحصار ہے؟

●●●

اردو دُنیا

دوردرشن نیوز چینل پر اردو کے اوقات میں اضافہ کرنے کے لیے

مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات سے اپیل

گلبرگہ (۵ر اکتوبر)۔ کانگریس لیڈر سٹی گلبرگہ جناب محمد عثمان علی گٹہ دار نے مرکزی وزیر برائے اطلاعات ونشریات جناب منیش تیواری کو ایک فیکس روانہ کرکے ان سے اپیل کی ہے کہ دوردرشن کے نیوز چینل پر اردو پروگرام کا وقت بڑھا کر صبح ایک گھنٹہ اور رات میں ایک گھنٹہ کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ فی الوقت نیوز چینل پر صبح میں صرف آدھا گھنٹہ اردو کے لیے مختص ہے جو قطعی ناکافی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے اوقات میں اضافہ کرکے روزانہ صبح میں ایک گھنٹہ اور رات میں ایک گھنٹہ وقت مختص کریں اور صبح میں اردو خبروں کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات کا جائزہ بھی پیش کیا جانا چاہیے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور

بی کام اردو میڈیم میں لکچررس کے تقرر کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۶ر اکتوبر)۔ بیرسٹر اسدالدین اویسی (ایم پی) نے گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور، (رنگا ریڈی ضلع) کے بی کام اردو میڈیم کورس کے لیے گزشتہ دو سال سے ریگولر لکچررس کے عدم تقرر پر اظہار تشویش کرتے ہوئے کلکٹر ضلع رنگا ریڈی سے تحریری نمائندگی کی ہے کہ وہ بی کام اردو میڈیم کے لیے ریگولر لکچررس اور مناسب اسٹاف کے جلد تقرر کے لیے متعلقہ حکام کو ضروری ہدایت دیں۔ بیرسٹر اسدالدین اویسی نے اپنے مکتوب میں کہا کہ گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور میں بی کام اردو میڈیم کورس کا تعلیمی سال ۱۱-۲۰۱۰ سے آغاز ہوا، تاہم ریگولر لکچررس کا تقرر نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اس کورس کے طلبہ جو کثیر تعداد میں ہیں ان کی تعلیم متاثر ہورہی ہے۔ اسی تعلق سے قبل ازیں بھی توجہ دلائی گئی تھی۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن میں دوسری سرکاری زبان اردو نظر انداز

چیئرمین واسٹاف کے چیمبر پر انگریزی تحریر، کمیشن کے بورڈ پر بھی انگریزی کا استعمال

حیدرآباد (۱۷ر اکتوبر)۔ حکومت نے ریاست میں اقلیتی اسکیموں پر موثر عمل آوری کی نگرانی اور اقلیتوں کے مسائل کی سماعت اور یکسوئی کے لیے ریاستی اقلیتی کمیشن قائم کیا ہے لیکن اقلیتی کمیشن کے دفتر میں اردو کو بہ حیثیت دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملا ہے۔ سکریٹریٹ میں واقع اقلیتی کمیشن کے دفتر، چیئرمین کے چیمبر اور ان کے اسٹاف کے چیمبرس پر صرف انگریزی تحریر ہے جب کہ یہاں اردو کو بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ اقلیتی کمیشن کے دفتر کا بورڈ صرف انگریزی میں تحریر کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کمیشن کے چیئرمین عابد رسول خاں کے نام کی تختی بھی صرف انگریزی زبان میں ہے۔ ان کے اسٹاف کے روم پر بھی صرف انگریزی تحریر دیکھی جاسکتی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ حکومت نے اردو کو پورے اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کا موقف دیا ہوا ہے۔ ریاستی وزراء، پرنسپل سکریٹریز اور دیگر عہدیداروں کے ناموں کی تختیوں پر انگریزی کے ساتھ تلگو اور اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے لیکن حیرت ہے کہ اقلیتی کمیشن کے سلسلے میں متعلقہ عہدیداروں نے اردو کو نظر انداز کردیا ہے۔ اردو والوں کا خیال ہے کہ حکومت اقلیتی کمیشن کو اس سلسلے میں کارروائی کرتے ہوئے جی اے ڈی کے عہدیداروں کو ہدایت دینی چاہیے کہ وہ یہاں اردو میں بھی بورڈ آویزاں کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ریلوے تقررات کے لیے اردو میں پرچہ لکھنے کی سہولت کے لیے وزیر ریلوے سے نمائندگی

گلبرگہ (۱۷ر اکتوبر)۔ مولانا محمد نوح (سابق کارپوریٹر) کی زیر قیادت ایک نمائندہ وفد نے آج مرکزی وزیر ریلوے ملیکارجن کھرگے کو ان کی رہائش گاہ پر ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے گلبرگہ میں ریلوے ملازمتوں کے لیے قائم کیے جارہے امتحانی مراکز میں کنڑا کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی پرچہ لکھنے کی سہولت مہیا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ یادداشت میں کہا گیا ہے کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے اقلیتی نوجوانوں کو ریلوے ملازمتوں کے حصول کے لیے انھیں اردو میں پرچہ لکھنے کی سہولت دی جائے۔ یادداشت میں کہا گیا ہے کہ سابق مرکزی وزیر ریلوے ممتا بنرجی نے ریلوے تقررات کے لیے اردو میں بھی پرچہ لکھنے کے احکام جاری کیے تھے۔ اس مناسبت سے گلبرگہ کے ریلوے امتحانی مراکز میں اردو میں بھی پرچہ لکھنے کی سہولت دی جائے۔ یادداشت میں علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے عوام کو مختلف ریلوے سہولیات مہیا کرنے پر ملیکارجن کھرگے کو مبارکباد بھی پیش کی گئی ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ادیب ماہر کی ڈگری انٹرمیڈیٹ کے مساوی

الہ آباد (۱۵ر اکتوبر)۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ کی ادیب ماہر کی ڈگری سیکنڈری ایجوکیشن کونسل کی انٹرمیڈیٹ کی ڈگری کے مساوی ہے۔ اسی طرح عدالت نے کہا ہے کہ ادیب کامل کی ڈگری کو بی اے کے مساوی سمجھا جائے گا۔ عدالت نے کہا ہے کہ درخواست دہندہ اردو مترجم کو اس کی ادیب ماہر کی ڈگری کو غیر تسلیم شدہ بتاکر ڈگری سے نکالنے کا حکم غلط ہے۔ جسٹس سبھاجیت یادو نے محمد اشتیاق انصاری کی درخواست پر یہ حکم نامہ جاری کیا ہے۔ درخواست دہندہ اردو مترجم کے عہدے پر فائز تھا جسے یہ کہہ کر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا کہ درخواست دہندہ نے صرف جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کا امتحان پاس کیا ہے۔ اس نے اس عہدے کے لیے انٹرمیڈیٹ کی لازمی شرط کا امتحان پاس نہیں کیا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

73 ہزار پرائمری اور 4 ہزار ثانوی اسکولوں میں معیاری تعلیم فراہم کرنے کے لیے مہم شروع

پٹنہ (۱۲ر اکتوبر)۔ اسکولی تعلیم میں معیاری تبدیلی کو اور بہتری کیسے دی جائے؟ اس سے فکرمند ریاستی حکومت نے اگلے تین ماہ اکتوبر سے دسمبر تک کی مدت طے کی ہے۔ اس میں تمام 73 ہزار پرائمری اور 4 ہزار ثانوی اسکولوں میں معیاری تبدیلی کے لیے مہم چلانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کے پرنسپل سکریٹری امرجیت سنہا نے تمام کمشنروں، علاقائی تعلیمی ڈپٹی ڈائرکٹرز اور ضلع تعلیمی افسروں کو خط جاری کیا ہے۔ طے وقت کے مطابق اگلے تین ماہ تک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں مسلسل معائنہ مہم چلے گی۔ اس میں اضلاع کے افسران کی شرکت یقینی ہوگی۔ معائنے میں تعلیمی کام، بچوں کی موجودگی، صفائی مہم اور غذائے مِڈ ڈے میل وغیرہ اسکیموں کے نفاذ کی معلومات بھی لی جائے گی۔ خامیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری تجاویز بھی دی جائیں گی۔ لائبریرین کی تنخواہ میں اضافہ ہوگا۔ ریاستی پلس ٹو اسکولوں کے تقریباً پانچ سو لائبریرین کی مقررہ تنخواہوں میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں وزیر تعلیم پی کے شاہی کی ہدایت پر ایک تجویز تیار کی گئی ہے جس پر جلد ہی منظوری لی جائے گی۔ آئندہ ۱۱ر نومبر سے تین روزہ یوم تعلیم جشن تاریخی گاندھی میدان میں منعقد ہوگا۔

(انقلاب۔ دہلی)

ضلع میدک میں اردو کی 369 اسامیاں تقرر طلب

میدک (۱۳ر اکتوبر)۔ مسلم ویلفیئر سوسائٹی میدک کا ایک وفد جس میں خواجہ معین الدین، محمد رحیم الدین، محمد نذیر خاں، حافظ محمد احمد علی فیصل اور محمد ریاض الدین شامل تھے، نے چیف منسٹر کرن کمار ریڈی، ریاستی وزیر تعلیم، صدر اقلیتی کمیشن عابد رسول خاں اور کمشنر اینڈ ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن سے تحریری نمائندگی کرکے مجوزہ ڈی ایس سی میں ضلع میدک میں واقع تمام اردو میڈیم مدارس میں اسکول اسسٹنٹ، لنگویج پنڈت اور پی ای ٹیز کی خالی اسامیوں کی نشان دہی کا مطالبہ کیا۔ وفد نے بتایا کہ ضلع کے بیشتر اردو اپر پرائمری و ہائی اسکولوں میں اساتذہ کی کمی سے طلبہ کو دشواریوں کا سامنا ہے، اس صورت حال کے باعث سرکاری مدارس میں اردو میڈیم طلبہ کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہورہی ہے۔ وفد نے چیف منسٹر، وزیر تعلیم اور دیگر عہدیداروں سے شکایت کی کہ ضلع مہتمم تعلیمات ضلع میدک کی سردمہری سے اردو طلبہ کا نقصان ہورہا ہے کیوں کہ ضلع بھر میں اردو اسکول اسسٹنٹ، لنگویج پنڈت، پی ای ٹیز کی خالی اسامیاں چونکا دینے والی ہیں۔ ضلع میں اردو میڈیم اپر پرائمری اور ہائی اسکولوں میں ریاضی، فزیکل سائنس، بایولوجیکل سائنس، سماجی علم، انگلش، اردو، تلگو پنڈت، اردو پنڈت اور پی ای ٹیز کی جملہ 369 اسامیاں تقرر طلب ہیں۔ ڈی ایس سی ۲۰۰۸ء میں ظاہر کردہ 25، ڈی ایس سی ۲۰۱۲ء میں ظاہر کردہ 23 اسامیوں کو ایس سی، ایس ٹی اور بی سی طبقات کے لیے محفوظ قرار دیا گیا، جن پر اب تک تقررات عمل میں نہیں لائے گئے، حالاں کہ ایس سی، ایس ٹی اور بی سی امیدواروں کی عدم دستیابی پر ان خالی اسامیوں کا موقف تبدیل کرکے ان پر اہل اردو میڈیم امیدواروں کا تقرر کیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ سوسائٹی کے عہدیداروں نے مطالبہ کیا کہ مجوزہ ڈی ایس سی اعلامیہ میں ضلع میدک میں اردو میڈیم کی تمام اسکول اسسٹنٹ کی خالی اسامیوں کی مکمل نشان دہی کرتے ہوئے ان پر تقررات کیے جائیں۔ کمشنر اینڈ ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن وانی موہن نے ضلع بھر کے اردو اسکولوں میں موجود خالی اسامیوں کی تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ایک مکتوب ڈی ای او میدک کو روانہ کرتے ہوئے اردو طلبہ سے انصاف کرنے کا تیقن دیا۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

میڈیا اردو کو عام فہم بنانے میں اپنا کردار ادا کرے

لاہور (۱۳ر اکتوبر)۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور محققین نے خبردار کیا ہے کہ اردو زبان کو انٹرنیٹ اور ٹکنالوجی کے ذریعے فروغ دینے کی کوشش نہ کی گئی تو یہ آئندہ پچاس برسوں میں ختم ہو جائے گی۔ جدید ٹکنالوجی کے ذریعے اپنی زبان کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے ذرائع ابلاغ پر زور دیا ہے کہ وہ اردو کو عام فہم زبان بنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ ملک میں اردو سمیت دیگر زبانوں کے فروغ کی خاطر لسانیات کے حوالے سے الگ ادارہ قائم کیا جائے۔ اردو کا مستقبل روشن ہے اور اس کے رسم الخط میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار لاہور میں منعقد ہونے والی دوسری دو روزہ عالمی اردو کانفرنس میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے دانش وروں نے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ کانفرنس میں پاکستان کے علاوہ برطانیہ، ترکی، چین، روس، ہندستان اور بنگلہ دیش سے آئے مہمان شریک تھے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

بھوج یونی ورسٹی میں اردو نصاب شامل

بھوپال۔ بھوج اوپن یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طارق ظفر نے ایک ادبی تقریب میں یہ اطلاع دی ہے کہ مدھیہ پردیش کی اس مراسلاتی یونی ورسٹی نے اپنے کورسز میں بی۔ اے اردو نصاب کو بھی شامل کرلیا ہے۔

(صدائے اردو۔ بھوپال)

عادل آباد کے پولیس دفاتر پر اردو سائن بورڈز کی تنصیب کے احکام

کاغذ نگر، آندھرا پردیش (۱۸ر اکتوبر) ضلع ایس پی عادل آباد کی جانب سے ضلع کے تمام پولیس دفاتر پر تلگو، اردو اور انگریزی زبان میں سائن بورڈز کی تنصیب کی ہدایت دی گئی ہے۔ کاغذ نگر جاگرتی یووا منچ کے صدر محمد اشرف نے اس سلسلے میں ضلع کلکٹر سے نمائندگی کی تھی۔ محمد اشرف نے بتایا تھا کہ اردو کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن ضلع عادل آباد کے کسی بھی دفتر میں اردو زبان پر عمل آوری نہیں ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں قانون حق معلومات کے تحت بھی تفصیلات حاصل کی گئیں۔ ضلع پولیس کی جانب سے ایس پی نے اپنے جواب میں بتایا کہ ضلع کے تمام پولیس دفاتر میں اردو، انگریزی اور تلگو میں سائن بورڈز کی تنصیب کی ہدایت جاری کردی گئی ہے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

13 مترجمین کی بحالی سے متعلق دستاویزات غائب

حق اطلاعات قانون کے تحت معاملات کے سامنے آنے پر بے چینی

بریلی (۱۳ر اکتوبر)۔ فائلیں غائب کرنے کا کھیل صرف بڑے بڑے گھوٹالوں میں ہی نہیں ہوتا بلکہ چھوٹے سطح پر بھی یہ کارنامے ہو رہے ہیں۔ حالیہ معاملہ ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے منسلک ہے جہاں سے شاہجہاں پور کے جی ایف کالج میں تیرہ مترجمین کی تقرری سے متعلق زیادہ تر ریکارڈ غائب ہیں۔ گزشتہ سال کیس کی معلومات حق اطلاعات کے ذریعے سامنے آئی تو کھلبلی مچ گئی۔ فوراً معاملے کی جانچ کے لیے جانچ کمیٹی کا بھی قیام کر دیا گیا، لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔

آر ٹی آئی ماہر گورو شکلا کو ان کی تقرری میں گڑبڑی کی بھنک لگی، اس پر گورو نے کہا کہ ان کا انتخاب کس قانون کے تحت کیا گیا ہے، اس کی معلومات آر ٹی آئی سے مانگی۔ جواب میں یونیورسٹی نے بتایا کہ دسمبر ۲۰۰۳ میں جی ایف کالج شاہجہاں پور میں تیرہ مترجمین کی تقرری یونیورسٹی کی سلیکشن کمیٹی کی منظوری سے کی گئی۔ جب مذکورہ سلیکشن کمیٹی کی منظوری سے متعلق دستاویزات مانگے گئے تو یونیورسٹی دستیاب نہیں کروا سکی۔ بتایا گیا ہے کہ مذکورہ دستاویز کی فائل غائب ہو گئی ہے۔ اس کی معلومات گورو شکلا نے گزشتہ سال اگست میں رجسٹرار ڈاکٹر کے این پانڈے کو دی تو انھوں نے جانچ کمیٹی تشکیل کر دی۔ ساتھ ہی علاقائی تعلیم افسر کو خط جاری کر کے سلیکشن کمیٹی کی منظوری کی صورت حال واضح نہ ہونے کی بات کہی۔ جانچ علاقائی تعلیم افسر کو دی گئی تو انھوں نے تیرہ مترجمین کی تنخواہ پر روک لگا دی تاہم کچھ ہی دنوں کے بعد بغیر تفتیش مکمل ہوئے تمام مترجمین کی تنخواہ جاری کرا دی گئی۔ معاملے کی جانکاری کے لیے گورو نے گزشتہ ہفتے کو دوبارہ معلومات طلب کی تو پتا چلا کہ پوری جانچ منظوری کی فائل پر آ کر رکی ہے، جو یونیورسٹی سے غائب ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر کے این پانڈے (رجسٹرار) کا کہنا ہے کہ گزشتہ سال ہی اس معاملے کی جانچ کے لیے جانچ کمیٹی تشکیل کی گئی تھی۔ منظوری سے متعلق فائل یونیورسٹی میں ابھی نہیں مل رہی ہے۔

ان 13 مترجمین کے نام ہیں: محمد ساجد خاں، ڈاکٹر عبدالحسنات، ڈاکٹر محسن حسن خاں، ڈاکٹر ادیب انجم رحمان، محمد سلیم احمد خاں، ڈاکٹر یحییٰ اختر، محمد اویس خاں، سید ایم ایچ رضوی، سید راشد حسین، ڈاکٹر غلام احمد قادری، ڈاکٹر فیاد احمد، ڈاکٹر محمد ارشد رضا خاں اور ڈاکٹر سہیل اختر نقوی۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو گھر، شادی خانوں کی تعمیر کے لیے پچاس لاکھ روپے کی منظوری

حیدرآباد (۱۷ر اکتوبر)۔ حکومت نے اضلاع محبوب نگر، نظام آباد اور کڑپہ میں اردو گھر شادی خانوں کی تعمیر کے لیے ایک کروڑ کی منظوری دی ہے۔ اس سلسلے میں سکریٹری اقلیتی بہبود احمد ندیم نے آج تین جی او جاری کیے۔ محبوب نگر ٹاؤن میں اردو گھر شادی خانوں کی تعمیر کے لیے پچاس لاکھ روپے منظور کیے گئے ہیں۔ ضلع کلکٹر محبوب نگر نے اس سلسلے میں تجاویز روانہ کرتے ہوئے حکومت سے درخواست کی تھی کہ تعمیری کام کے سلسلے میں پچاس لاکھ روپے منظور کیے جائیں۔ کلکٹر کی تجویز کا جائزہ لینے کے بعد حکومت نے پچاس لاکھ روپے کی منظوری دی ہے۔ ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈمی کو ہدایت دی گئی کہ وہ یہ رقم ضلع کلکٹر کو جاری کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو اسکول کے قیام کی ضرورت

سرینواس پور، کرناٹک (۵ر اکتوبر)۔ سرینواس پور شہر ریاست کرناٹک کا معروف شہر ہے۔ اس شہر میں کئی کنڑا اسکولس موجود ہیں لیکن یہاں ایک سرکاری اردو اسکول کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ یہاں دن بہ دن لسانی اقلیت کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے اس لیے یہاں کے ڈاکٹر حسین محلے کے سماجی کارکن شبیر احمد کے علاوہ کئی مقامی افراد حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہاں جلد ہی ایک سرکاری اردو اسکول قائم کیا جائے تاکہ اقلیتوں کے بچوں کو سہولت ہو۔ ریاستی حکومت تعلیم کو ریاست کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے کئی اسکیم کو نافذ کر چکی ہے جس سے ریاست کا ہر طبقہ استفادہ کر رہا ہے، یہاں کے اقلیتی طبقے کو ریاستی سرکار سے امید ہے کہ وہ اردو سرکاری اسکول کو قائم کرنے کے لیے جلد ہی اقدام کرے گی۔

(سالار۔ بنگلور)

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر، ادیب، مفکر اور اردو کی مشترکہ تہذیب کے پروردہ و نمائندہ قلم کار ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا لندن میں ۲۹ر ستمبر ۲۰۱۳ کو انتقال ہو گیا۔ وہ 75 سال کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ ۱۹۶۲ میں ہی وہ لندن چلے گئے تھے۔

وطن ثانی برطانیہ میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی پہلی پہچان ایک کامیاب سیاست داں کی تھی۔ وہاں کی سیاست میں موصوف ایک نمایاں ایشیائی ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ حال ہی میں نیدرلینڈ کے شہرۂ آفاق تحقیقی ادارے انٹر نیشنل اوپن یونیورسٹی (IOU) نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔ یوروپ میں بہت کم ایشیائیوں کو یہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے برعکس اردو دنیا ڈاکٹر آنند کو ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانتی پہچانتی ہے۔ ڈاکٹر آنند کی پچاس سے زیادہ شعری، ادبی اور دستاویزی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو میں ان کے سات دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی دو نثری کتابیں 'جنگ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر' اور 'مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مضامین' بہت مشہور ہوئیں۔ اول الذکر کتاب کی رسم رونمائی ۲۳ر اکتوبر ۲۰۰۸ کو لال قلعہ، دہلی میں بہت بڑے پیمانے پر ادا کی گئی تھی۔ کتاب کا اجرا اس وقت کے ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی کے دست مبارک سے ہوا تھا۔ ڈاکٹر آنند اردو کے شیدائی اور سچے سیکولر ذہن کے مالک تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (ادارہ)

○

مدھیہ پردیش کے معروف شاعر جناب مسعود علی خاں اختر کا ۱۷ر اگست ۲۰۱۳ کو انتقال ہو گیا۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان 'آئینۂ فکر' ۱۹۹۸ میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ ریاست بھوپال کے زمانے کے مشہور نواب یوسف علی خاں کے صاحبزادے تھے۔ سیہور کلکٹری میں ملازم تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد بھوپال منتقل ہو گئے تھے۔ مسعود علی خاں اختر کافی عرصے سے بیمار تھے اور صاحب فراش تھے۔ مرحوم کی تدفین بڑے باغ قبرستان میں عمل میں آئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

آرٹی سی بسوں کے بورڈز پر اردو ندارد

ونگول، آندھرا پردیش (۱۸ر اکتوبر)۔ نارائن پیٹ ڈپو کے آر ٹی سی بسوں کے بورڈز پر مقامات کے نام اردو میں تحریر نہ ہونے سے اردو داں مسافرین کو مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جناب ناصر خاں نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ریاست آندھرا پردیش کے کئی اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے جس میں ایک ضلع محبوب نگر بھی ہے۔ محبوب نگر ضلع کے تقریباً تمام آر ٹی سی بسوں کے مقامات کے ناموں کے بورڈز کو صرف تلگو ہی میں تحریر کیا گیا ہے جب کہ محبوب نگر ضلع میں عوام کی کافی تعداد اردو جاننے والی موجود ہے، مگر پھر بھی اردو کے بورڈز نظر نہیں آتے جس سے اردو مسافروں کو کافی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ ناصر خاں نے کہا کہ سرکاری عہدیداران بھی اردو کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ سوتیلا سلوک اختیار کر رہے ہیں۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ضلع محبوب نگر کے تمام آر ٹی سی ڈپو منیجرس کو ہدایت جاری کی جائے کہ جلد سے جلد آر ٹی سی بسوں کے بورڈز پر اردو بھی تحریر کر کے مقامات کی نشان دہی کریں تاکہ اردو داں مسافروں کو سہولت ہو سکے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

***

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے
دو کتابوں کا
آنا ضروری ہے

نام کتاب : سعادت حسن منٹو
عصرِ حاضر کے آئینے میں
مرتب : نور حسین پرکار
ضخامت : ۱۴۴ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ہندستانی پرچار سبھا، مہاتما
گاندھی میموریل بلڈنگ
۷- نیتاجی سبھاش روڈ،
ممبئی-400002
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

مذکورہ بالا کتاب ہندستانی پرچار سبھا کی جانب سے برصغیر کے مقبول ترین افسانہ نگار کو خراجِ عقیدت کے طور پر شائع کی گئی ہے جس میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے بارے میں ۱۴ مضامین شامل ہیں۔

پہلے مضمون میں کے کے کھلر نے منٹو کے کشمیری النسل ہونے، ان کی حیات کے چند اہم گوشوں اور ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی منٹو کو اردو ادب کا 'پروڈ تھیس' قرار دیا ہے۔ بقول کھلر "یونیورسٹی کے پروفیسر نما نیم نقاد اور اردو کے ریسرچ اسکالر انگشت بدنداں ہیں کہ وہ شخص جو دسویں جماعت کے اردو کے پرچے میں فیل تھا ایسے خوب صورت افسانے ایسے خوب صورت انداز میں کیسے لکھ گیا۔" وہ ہم عصر افسانہ نگاروں پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "آج کل کا افسانہ نویس قبریں کھودتا ہے لیکن اسے کچھ نہیں ملتا۔"

دوسرے مضمون میں اردو کے پہلے نثری نظم نگار کا سہرا پروفیسر صادق منٹو کے سر باندھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون میں موصوف کے ترقی پسند رجحان کی نشان دہی کی ہے اور اس سلسلے میں افسانہ 'بابو گوپی ناتھ' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ممد بھائی اور منگو کوچوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ نور شاہ نے منٹو کی فلموں سے وابستگی، اس کی فلمی کہانیوں اور مکالمہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد ایوب واقف نے مجاز اور منٹو کی زندگی کا موازنہ کرکے ان کی ضدی فطرت، بلانوشی، چھوٹی عمر میں ہی فن کی بلندیوں کو چھونے اور پھر ناگہاں موت سے ہمکنار ہونے کا ذکر کیا ہے۔ منٹو کے شاہکار افسانے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا پس منظر اور اس کا تجزیہ ڈاکٹر محمد تقیم احمد کاظمی نے اپنے مضمون 'تقسیم وطن اور منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں بڑی دقیقہ شناسی سے کیا ہے۔ اسی تناظر میں افسانہ 'ٹیٹوال کا کتا' کا جائزہ محمد اسلم پرویز نے 'بھونک کر بتانے والی بات' عنوان کے تحت بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'ٹیٹوال کا کتا' کو ایک ہی تخلیقی رویے کے دو اسلوبیاتی مظہر مانتے ہیں۔ آخری ایام میں منٹو کی کسمپرسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "پیسوں کی تنگی اور شراب کی ضرورت نے انھیں روزانہ ایک افسانہ لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

م ناگ (منٹو: ایک سرسری جائزہ) اور منیر حسین حزہ (منٹو: شخصیت کا مختصر ترین مطالعہ) نے بھی منٹو کی شخصیت پر مضامین قلم بند کیے ہیں۔ البتہ منٹو کے معاصروں، احمد ندیم قاسمی (سچا اور کھرا منٹو) اور شاہد احمد دہلوی (منٹو)، جنھوں نے اسے روبرو دیکھا تھا کے تاثرات بہت ہی اہم ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆ "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمھیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔" (سچا اور کھرا منٹو)

☆ "تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟" (ایضاً)

☆ "منٹو کی اب وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی اور مجاز کی تھی، بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔"
(منٹو۔ شاہد احمد دہلوی)

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ منٹو کے فنی پہلوؤں پر لکھے گئے بصیرت افروز مضامین یوں ہیں: ڈاکٹر عظیم احمد کا 'سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری'، ڈاکٹر شہباز بانو علی مظہر کا 'سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری'، ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری کا 'منٹو کی خاکہ نگاری کا ایک تجزیاتی مطالعہ'۔ مضامین کے بعد نمونے کے طور پر منٹو کے دو افسانے 'الّو کا پٹھا' اور 'نیا قانون' بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے اختتام پر منٹو اور اس کے احباب و اقارب کی چند تصویریں بھی شامل ہیں۔

مجموعی طور پر زیرِ نظر کتاب ہمہ جہت افسانہ نگار منٹو کی شخصیت اور فن پر طائرانہ نظر ڈالنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور اس لیے منٹویات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

•••

نام کتاب : **عطاء اللہ پالوی**
نقیبِ فکر و آگہی (حصہ پنجم)
مصنف : قمر امام
ضخامت : ۵۷۶ صفحات
قیمت : ۳۶۹ روپے
ملنے کا پتہ : حسین ساج پالی کالونی
پٹنہ-۸
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

قمر امام کا نام اردو ادب میں نثر کی بیشتر اصناف میں نمایاں مقام پر نظر آتا ہے۔ وہ ناول نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، مضمون نگار، کالم نگار، خاکہ نگار اور نقاد و محقق بھی ہیں۔ انھیں عطاء اللہ پالوی سے دلی عقیدت اور محبت ہے۔ ان کو احساس ہے کہ پالوی صاحب کو تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے نظر انداز کیا ہے۔ قمر امام نے عطاء اللہ پالوی کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ 'عطاء اللہ پالوی نقیبِ فکر و آگہی' کے عنوان سے کتاب کی چار جلدیں اس سے پہلے طبع ہو چکی ہیں۔ قمر امام نے اب اس کی پانچویں جلد طبع کی ہے۔

عطاء اللہ پالوی محقق اور تخلیق کار تھے۔ خاکہ نگاری میں بھی ان کی الگ پہچان ہے۔ قمر امام، پالوی صاحب کے کاموں کی جہات کے متعلق پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

"پالوی نے اردو زبان و ادب میں ایک نئی راہ ہموار کی ہے۔ خاکہ نگاری میں ایک نیا رخ اپنایا۔ تنقید کی دنیا میں لوچ پیدا کیا، تحقیق و تلاش میں گہرائی اور سخت جانفشانی کی راہ اپنائی، تعریف بے جا سے اپنے قلم کو دور رکھا اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا۔" (صفحہ ۱۶)

عطاء اللہ پالوی نے مرزا شوق پر تحقیق اور تلاش کا کام بڑی عرق ریزی سے انجام دیا، اور مرزا شوق کی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ 'تذکرۂ شوق' تحقیقی تصنیف کی۔ اس کے بعد شوق کی مثنویات پر ایک طویل مقالہ 'مثنویاتِ شوق' مرتب کی۔ اردو مثنویوں پر بہت کم کام ہوا ہے۔ پالوی صاحب نے شوق کی مثنویوں کے علاوہ بھی اردو کی دیگر مثنویوں پر بھی کام کیا ہے۔ قمر امام نے زیرِ تبصرہ کتاب میں مثنویاتِ شوق سے متعلق پالوی صاحب نے جو بھی خامہ فرسائی کی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

قمر امام نے کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کے کئی ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ پیش لفظ کے بعد 'ایک نئی دیوار' کے عنوان سے پہلے باب کی ابتدا کی ہے۔ اس کے بعد پالوی کی تحقیقی کتاب 'تذکرۂ شوق' کا پیش لفظ شامل کیا ہے، جس سے پالوی کی ادبی تحقیق اور ریاضت کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے صرف مثنویوں کو ہی اپنی جولانگاہ نہیں بنایا بلکہ جس مطبع سے مثنوی شائع ہوئی اس کی بھی تحقیق مع متعلقین کے کی ہے۔

قمر امام نے باب اول میں پالوی کی انفرادیت، تذکرۂ شوق: ایک مختصر جائزہ، معاصرینِ شوق، مرزا شوق کی وفات، مثنویاتِ شوق کی تعداد، اختلافات، اعتراضات، غلطیاں اور کمزوریاں، مثنویاتِ شوق کے ماخذ اور پالوی بہ حیثیت شاعر وغیرہ عنوانات قائم کیے ہیں۔

باب دوم میں قمر امام نے پہلا عنوان 'معتبر محقق کی تحقیق اور عطاء اللہ پالوی' قائم کیا ہے، اس کے علاوہ مثنویات کا زمانۂ تحقیق... مطبوعہ نسخے، ذیلی عنوانات، اشعار کی کمی بیشی، مثنویاتِ شوق کے ماخذ، دبستانِ لکھنؤ، مثنوی بہارِ عشق اور مثنوی لذتِ عشق عنوانات ہیں۔

قمر امام نے بہارِ عشق اور اس کے محاسن بتانے کے علاوہ عبدالقادر سروری کا مضمون 'اردو مثنوی کا ارتقا' اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ کا مضمون 'مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں' بھی اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین کی تصنیف 'اردو مثنویاں شمالی ہند میں' کے اقتباسات مثنویاتِ شوق کے متعلق بھی کتاب میں شامل کر دیے ہیں (ص ۳۵۴)۔ عطاء اللہ پالوی کا مضمون 'زہرِ عشق کی بلند پایگی' بھی کتاب میں شائع ہوا ہے۔

کتاب کے آخر میں 'فکر اپنی اور کچھ اوروں' کے عنوانات کے تحت قمر امام نے عطاء اللہ پالوی اور مرزا شوق کی مثنویات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"محترم مرزا شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' کے اشعار کی پالوی حسین الفاظ اور لطیف پیرائے میں سبک رفتاری سے ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں کہ 'زہرِ عشق' کا حسنِ بیان پالوی کے قلم سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ پالوی نے قلم کی سحر کاری سے مثنوی کی تشریح میں روح پھونک دی ہے... جس طرح مرزا شوق کی مثنوی لافانی ہے اسی طرح پالوی کا 'تذکرۂ شوق' اور 'مثنویاتِ شوق' لافانی ہے۔" (ص ۵۳۵)

کتاب 'عطاء اللہ پالوی: نقیبِ فکر و آگہی' (حصہ پنجم) بہت اچھی صاف ستھری آفسٹ پر طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ قمر امام نے بڑی محنت، خلوص اور لگن کے ساتھ عطاء اللہ پالوی کے تحقیقی کام کو قارئین کے تفصیلی مطالعے کے لیے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ہر یونیورسٹی اور کالج کی لائبریریوں میں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

نام کتاب : نیرنگِ حقیقت
مصنف : سید شبیہ الحسن زیدی
ضخامت : ۲۰۰ صفحات
قیمت : ۵۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

اردو زبان میں شائع ہونے والی زیادہ تر کتابیں اردو ادب سے تعلق رکھتی ہیں لیکن گاہے بگاہے اردو میں براہِ راست یا بالواسطہ کچھ ایسی کتابیں بھی منظرِ عام پر آ جاتی ہیں جن کا تعلق اردو ادب سے نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ کسی دیگر مضامین سے متعلق ہوتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'نیرنگِ حقیقت' بھی سید شبیہ الحسن زیدی کے کچھ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو بلاشبہ معلوماتی ہیں جس میں 'ازلی سچ' اور 'عصرِ حاضر' کے عنوان سے مذہب اور سیکولرزم، اخلاقیات اور عالمی معیشت وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کتاب کا تعارف انگریزی میں پروفیسر شبیہ حیدر زیدی نے لکھا ہے، پیش لفظ اقبال مرزا نے لکھا ہے اور حرفِ آغاز مصنف سید شبیہ الحسن زیدی نے لکھا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں مصنف خود رقم طراز ہیں:

''زیرِ نظر مضامین ۲۰۰۸ سے ۲۰۱۴ کے دوران تحریر کیے گئے ہیں، حصہ اول اژلی معمہ میں سائنس کے جدید ترین انکشافات اور تجرباتی نتائج و حقائق کو اردو داں قاری کے لیے مذہب، اسلام اور مابعد الطبیعات کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے... ان مضامین میں بیان کردہ تمام سائنسی معلومات اور حقائق مستند اور تصدیق شدہ نتائج اور تشریحات کے مطابق ہیں، اردو میں سائنس، معاشیات، ماحولیات اور جدید معاشرتی رجحانات کے بارے میں نصابی کتب کے علاوہ بہت کم مواد دستیاب ہے۔ شاید یہ مضامین کچھ اردو داں سائنس دانوں، دانش وروں اور لکھنے والوں کے لیے غیر روایتی موضوعات پر لکھنے کا محرک بن سکیں''۔

اس تفصیلی بیان سے کتاب میں شامل مضامین کی غرض و غایت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہر مضمون انتہائی معلوماتی ہے۔ ان کے مضامین میں عام انسان کی فکر اور مروجہ معاشرے کی فکر اور روایت سے بالکل الگ ایک نئی فکر، نیا نکتہ فراہم کیا گیا ہے۔ جس پر ہمیں غور و خوض کرنا چاہیے کہ کیا واقعی یہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان مضامین میں انسانی ذہنوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور نئی نئی توضیحات و تشریحات پر غور کرنے، نئے انداز میں تجزیہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ سائنس اور وحدت الوجود یا پھر گمان اور حقیقت یا جبر و اختیار جیسے خشک موضوع کو واضح اور دلیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور انسانی عقل، فہم، ادراک، شعوری رد عمل کے ذریعے خلاف معمول بات کی وضاحت بھی مدلل انداز میں اس طرح کی گئی ہے کہ شک، یقین میں بدلنے لگتا ہے۔ کئی جگہوں پر اردو کے حوالے سے اپنی کم علمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مضمون کی چاشنی کے لیے غالب اور دیگر شعرا کے مناسب اور برمحل اشعار بھی شامل ہیں۔ سائنس سے متعلق کئی اہم مضامین مثلاً زندگی کا ساز اور ایٹم کا رقص، ایٹم، انسان اور کائنات، جرثومہ ابتدائے حیات کا رازداں، بلیک ہولز اور گلیکسی وغیرہ۔ باب دوم میں پاکستان کا مستقبل کے عنوان سے بحث کی گئی ہے۔

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سائنسی دریافت، انکشافات اور مشاہدات اور عملی تجربات کے ذکر پرمبنی ہے۔ امید کہ اس کوشش کو اردو داں طبقے میں پسند کیا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

●◆●

بقیہ: کون اس عہد میں سچ بولے گا؟

صفحہ ۳ سے آگے

میں جذب و پیوست کرکے پیرایۂ تخلیق میں ڈھالتا ہے۔ ہر چند کہ اس عمل میں اس کا کسب محنت صرف اس کی تخلیق سے ہوتا ہے، لیکن سے ہوتا ہے لیکن پھر بھی زندگی میں اس کی شرکت، فسادات سے نفرت، انسانیت سے محبت فطری اور فکری طور پر لاشعوری طور پر کام کرتے رہتے ہیں اور بڑا کام کرجاتے ہیں۔ تخلیق سے پھوٹنے والی یہ آنچ، یہ روشنی اور درد کا احساس و اظہار انسان دوستی کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جو مقدس کتابوں میں بھی نہیں نظر آتا۔ فراق گورکھپوری کا ایک شعر ہے:

ہر اک آنکھ کے آنسو ہیں اپنی پلکوں میں
ہر اک سینے میں جو درد ہے ہمارا ہے

بہت پہلے امیر مینائی نے بھی کہا تھا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اور فیض کا یہ شعر دیکھیے:

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

لیکن کل کے مقابلے آج یہ سوچنا ضروری ہوگیا ہے کہ یہ خنجر کہاں سے چل رہا ہے اور کیوں چل رہا ہے، یہ دہشت کیسی ہے، انسانیت خوف زدہ کیوں ہے۔ انسان اتنا خود غرض بلکہ خونخوار کبھی نہ تھا۔ سیاست داں اتنے خطرناک کبھی نہ تھے، حد یہ کہ آج صنفِ نازک بھی وہ نہیں ہے جس کا لطیف تصور کبھی ہمارے ذہن میں شہد گھول دیا کرتا تھا۔ چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں انسان کی قیمت گھٹ رہی ہے۔ جو انسان بولتا ہے وہ حملے کا شکار ہوجاتا ہے باقی آتنک کے ڈر سے خاموش ہیں — کیا اس غیر اخلاقی اور غیر انسانی صورتوں کو بے نقاب کرنے، ان کے خلاف بولنے اور لکھنے کی ذمے داری ہم پر نہیں ہے؟ کیا سماج، تاریخ اور عہد کی پکار اور للکار ہمیں سنائی نہیں دے رہی ہے؟ جب کہ عہد کی پکار، وقت کی للکار اندر ہی اندر سے ہر قسم کی تعمیر اور تحریک کی تلاش میں سرگرداں ہے — اس نازک وقت پر باہم مختلف ہونے کے بجائے ان تمام تازہ ترین استحصالی قوتوں کے بارے میں مل جل کر سوچنے اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق اس سے نپٹنے، معیشت و معاشرت کو متوازن و ہموار کرنے کی فکر ہی نہیں، جد و جہد بھی کریں۔ قلم اور قدم دونوں سطح پر، اس لیے کہ زندگی باقی رہے گی، انسان باقی رہے گا تو زبان و ادب، تہذیب و تمدن بھی باقی رہے گا۔ انسان قتل ہوجائے اور ادب باقی رہے یہ ممکن نہیں۔ یہ موٹا سا فلسفہ ہمیں سمجھ لینا چاہیے خاص طور پر ان لوگوں کو جو ہمہ وقت صرف ادب کی ادبیت اور شعر کی شعریت کی ہی فکر کرتے رہتے ہیں، انسانیت کی نہیں — ایک سچا ادیب واقعی سماج اور عوام کی طاقت بن کر ابھرے گا، ان کی آواز اور ملک و معاشرے کی آواز بن کر ابھرے گا تو یقیناً دائمی زندگی کا حق دار ہوگا اور اس کا نام اور کام باقی رہے گا ورنہ وقت کے سیلاب میں کتنے خس و خاشاک بہہ گئے۔ ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کو صدی پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تحریر و تخلیق پر اپنی گفتگو ختم کروں۔ ترقی پسند ادب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے موجودہ حقیقت کا مطالعہ ضروری ہے جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔ سماجی کشمکش اور اس کی جڑوں تک پہنچنا ضروری ہے اور ان عوام کے ہاتھوں میں ہاتھ دینا ضروری ہے جو ہمارے خوابوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے تراش کر حقیقت کا حسین اور پُرشکوہ مجسمہ تیار کریں گے اور یہ کام بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے سوز و گداز کی ضرورت ہے جو انسانوں سے بے پناہ محبت اور خلوص سے پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے اپنے کتب خانوں، شیش محلوں سے باہر نکلنے اور شہرت و عظمت کے بلند معیار سے نیچے اتر کر وسیع انسانیت کے سمندر میں تیرنا ضروری ہے''۔

اور پھر یہ مظلوم سوال بھی:

کون اس عہد میں سچ بولے گا؟
حرف آتے ہیں انگاروں میں پانی کی طرح
حکم شاہی کی طرح
اور پھر آتے ہیں اور بھی حرف
صف بہ صف دست بجولاں پابند ہوئے
ایک بھی حرف نہیں جو دل و جاں بن جائے
عہد حاضر کی زباں بن جائے

●◆●

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں	خلیق انجم	۲۰۰/=
پہلا ورق (سہ ماہی 'اردو ادب' کے منتخب اداریے)	اسلم پرویز	
انتخاب و ترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی		۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمن	۲۵۰/=
ہانگل	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خاں اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات)		
مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم		۱۵۰/=
ہندستان میں اردو سیاست کی تنظیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب: ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عابد اللہ غازی	۸۵/=
بگ کنٹل (ماحولیاتی آلودگی پر طویل ڈراما)	ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکان شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	شمیم حنفی	۲۰۰/=
دہلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
غالب تحقیق	جاوید رحمانی	۱۱۰/=
سن ستاون کی دلّی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندستان میں اردو زبان، تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۴۰/=
ہندستان میں فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر		
	صدیق الرحمن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Indar [اندر سبھا] (سید آغا حسن امانت)		
	افروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شیو رانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۲۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (منیجر پانڈے)	مترجم: سرور الہدیٰ	۲۰۰/=
دہلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن		
	مترجم: مسعود الحق	۲۷۵/=
گفتگو ان کی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=
جہانِ اقبال	عبدالرحیم خاں	۷۵/=
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (سیاسی اور سماجی پس منظر میں)		
	ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی	۸۵/=
ہم سفروں کے درمیان	شمیم حنفی	۱۵۰/=
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیوناگری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۶۰/=
محقق غالب کالی داس گپتا رضا	محمد عارف خاں، ثاقب صدیقی	۸۰/=
ہماری رسمیں	ڈاکٹر نریش	۸۵/=
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۲۲۰/=
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/=
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/=
دیوانِ بیان (احسن اللہ خاں بیاںؔ)	ارجمند آرا	۱۵۰/=
نوادرِ اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۳۰/=
بھگود گیتا (اردو منظوم)	شان الحق حقی	۷۰/=
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/=
انتخاب جدید (۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۲ء)	آل احمد سرور، عزیز احمد	۱۲۰/=
مصطلحاتِ ٹھگی (علی اکبر الہ آبادی)	رشید حسن خاں	۱۲۰/=
انتخاب عزیز لکھنوی	خلیق انجم	۳۰/=
انتخاب فراق گورکھپوری	انجمن ترقی اردو (ہند)	۳۰/=

تیسری اور آخری قسط

فعلِ متعدّی

فہمیدہ ریاض

میں ان کے مزار پر جا پہنچی۔ یوں تو یہ اردو ڈکشنری بورڈ کا ایک فرض منصبی تھا لیکن اب میرے دل میں اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

پرانے کراچی کے ایک گجراتی پاڑے میں... پہلے یہ عمارت ایک مندر تھی۔

تقسیم کے بعد، جب مہاجرین نے یہاں پڑاؤ ڈالا تو اسے انجمن ترقی اردو کو دے دیا گیا۔ یہیں مولوی عبدالحق کی رہائش گاہ تھی۔ عجیب انسان تھے۔ لوٹ کھسوٹ کے اس زمانے میں بھی ان پر ہر طرف رواں ذہنیت کا اثر نہ ہوا۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے لیے کوئی ذاتی جائداد نہیں بنائی اور نہ دولت جمع کی۔ وہ جن لوگوں کو انجمن میں لائے انھوں نے خود عبدالحق کو انجمن سے بے دردی سے بے دخل کر دیا۔

انجمن کے کارکنوں کو ان سے ملنے کی ممانعت، یہیں اسی عمارت کی اوپر والی منزل میں وہ ایک طرح محصور کر دیے گئے تھے۔ بجلی کا کنکشن منقطع، پانی کا کنکشن بند ... پڑے پڑے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یا اللہ پاک... عبدالحق اس سلوک کے تو مستحق نہ تھے۔ کیا انھیں اورنگ آباد کی وہ کوٹھی یاد آتی ہوگی جہاں وہ بزرگوں کی محفلیں کرتے دیکھتے تھے... کیا کسی لمحے؟ یہ ان کے ساتھ کیا ہوا!!

اور جناح؟ ایئرپورٹ پر انھیں لینے ایک شکستہ گاڑی... راستے میں گاڑی کا بریک ڈاؤن... اور ان کی خیر خبر لینے والا کوئی بھی نہ تھا؟

کیوں؟

آخر کیوں؟

میں مزار کے گرد و نواح پر نظر ڈالتی ہوں۔

پرانا کراچی... یہیں کہیں برنس روڈ کے پاس بندر روڈ پر قرۃ العین حیدر اپنے بھائی اور والدہ کے ساتھ ٹھہری تھیں۔

وہ میری نسل کے بچپن کا زمانہ تھا۔

'آگ کا دریا' میں قرۃ العین نے لکھا تھا:

"جب تاریخ نے مسلمانوں کو اپنی تقدیر آپ بنانے کا موقع دیا تو انھوں نے اس قدر گھٹیا پن کا مظاہرہ کیوں کیا..."

اس کا جواب بھی انھوں نے دیا:

"وہ باہر سے آنے والے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کے لیے اجنبی تھے"۔

شاید میں ان سے اتنی متفق نہ ہو سکوں۔ میں پوچھوں کہ مقامی لوگوں نے اپنے لیے، اپنے لوگوں کے لیے کیا کیا؟

مولوی صاحب کی برسی کا مختصر اجلاس اچانک درہم برہم ہو گیا۔ اردو یونیورسٹی کے کچھ اراکین آ پہنچے۔ وہ مہمانِ خصوصی کو ایک سیمینار میں لے جانا چاہتے تھے۔ اب مزید کارروائی نہیں ہوگی۔ سب نے جلدی جلدی اپنے لائے ہوئے ہار پھول مولوی عبدالحق کی قبر پر چڑھائے ... ایک بھونڈی جلد بازی کے ساتھ۔

"آپ بھی چلیے"۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ پھر اضافہ "میں نے تو آپ پر تھیسس لکھا تھا"۔

نہ جانے جھوٹ بول رہے تھے کہ سچ... مگر میں نہ گئی۔ واپس گھر آ گئی۔ طبیعت اداس تھی۔

انجمن ترقی اردو کا اردو کے بہترین ادیبوں سے اس قدر فاصلہ کیوں رہا؟ اور آج بھی کیوں ہے؟ کیا فیض، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، مسعود اشعر، حسن منظر، آصف فرخی... اجمل کمال اردو کے لیے کام نہیں کر رہے؟

انجمن کے ایک سینئر کارکن بولے "ہم آپ کو بلائیں گے"۔

میں کیوں آؤں گی؟ اس نئے عجیب و غریب عہدے کے باعث؟

یہ ایک ترقی پسند تحریک کے متوازی تحریک تھی... جس نے اپنی داغ بیل ڈالنے والے کی ایسی درگت بنائی کہ الامان والحفیظ!! اور انھیں اس حالت سے نجات کس نے دلائی؟

قدرت اللہ شہاب اور ابن انشا نے... ایوب خاں کے دور میں...

لیکن پھر عبدالحق صاحب نے ترقی اردو بورڈ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کے کام میں بہت زیادہ دخل اندازی کی جا رہی تھی۔

چلے گئے عبدالحق، بالآخر...

انجمن اب بھی ہے۔ اسے کچھ فنڈز ملتے ہیں۔ (تو) جو ایک شمع ہیں، جس کے گرد کچھ پروانے منڈلاتے رہتے ہیں، کہیں آس پاس پھل پھول رہا ہے ڈیکیڈینس اور ڈی جنریشن... ہاں ہاں! اب میں اس کے عین وسط میں ہوں۔ لوٹ لگا رہی ہوں اس میں جیسے بھینس کیچڑ میں لوٹ لگاتی ہے۔

میں کیچڑ کو سمجھنا چاہتی ہوں۔ عبدالحق صاحب آپ کیچڑ نہ تھے۔ آپ اپنے ماضی کو بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر کے یہاں لے آئے تھے۔ آپ اردو ہندی کے تناظر میں سوچتے تھے۔ اردو ہندی ٹکراؤ پر شاید حیران رہ جاتے... اردو بھی! مسلمانوں کی تو اتنی تو زیادہ زبانیں ہیں، اس برِصغیر میں! کہا گیا ہے کہ عبدالحق صاحب نے بنگالی کے خلاف بھی تحریک چلائی۔

پھر بھی اگر وہ اپنی زبان سے پیار کرتے تھے، اس کی ترقی کے لیے کوشاں تھے، تو اس میں ان کی ذاتی برائی نہ تھی۔ جس طرح اگر کسی بنگالی یا سندھی یا پنجابی کو اپنی زبان سے پیار ہو، اور وہ اس کی ترویج و ترقی کے لیے دل و جان سے اپنی ساری زندگی وقف کر دیں، تو ہم دل سے ان کی عزت کریں گے... کریں گے یا نہیں؟

ہماری سیاسی تاریخ پیچیدہ ہے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو منطق کے اصولوں پر نہیں بیٹھتا۔ پاکستان کی تحریک ہندستان کے مسلم اقلیتی صوبوں میں جس جوش و خروش سے چلائی گئی تھی اور وہ جن نکات پر مشتمل تھیں جس کا اردو ایک اہم حصہ تھا، جغرافیائی پاکستان کی طبیعی حقیقت سے ایک حد تک نا آشنا تھی۔ بعد میں اسی لیے بنگال میں اردو کا بنگالی سے ٹکراؤ ہوا اور سندھ میں اردو کے خلاف محاذ کھل گیا۔

ہندستان کے مختلف صوبوں، خصوصاً جنوبی ہند میں ہندی کو اسی تضاد کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں سرکاری حد تک انگریزی رائج ہوگئی۔ لیکن یوپی، بہار میں زیریں سطح پر پرانا ماضی اب تک سانس لے رہا ہے۔ ہمارے ہندستانی پولیس افسر دوست ہنس کر بتا رہے تھے۔ "الٰہ آباد" کے تھانے میں رپورٹ اب بھی اس طرح لکھی جاتی ہے، "چور نے عقب سے نقب لگائی"۔ تو اردو بھی ہندستان میں عقب سے نقب لگائے بیٹھی ہے۔

یہ انگریز تھا جس نے انتظامی سہولت کے لیے پورے ہندستان میں اردو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ کراچی کے تھانوں میں بھی ایف آئی آر انگریز کے زمانے کی زبان میں لکھی جاتی ہے۔

کیا انگریز نے اچھا کام کیا تھا؟ واللہ اعلم! ساتھ ہی اس نے اردو کو ہندی سے جدا بھی کیا، اور دوسری زبانوں کی ترقی کے لیے (مثلاً سندھی کے لیے) عرق ریزی سے کام کیا اور کروایا۔

اکثر سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب انگریز کی سازش تھی۔ شاید ایسا نہیں تھا! شاید وہ ان کاوشوں سے مستقبل میں ابھرنے والے تضاد اور تصادم کا اندازہ بھی نہ کر سکتے ہوں!

بنیادیں، بہرحال بیتی ہوئی کتنی صدیوں نے ڈالی ہیں، جس کے باعث اردو بچے کھچے پاکستان کی قومی زبان ہے، رابطے کی زبان اور اسے پڑھنے والے لوگ چاروں صوبوں میں موجود ہیں۔ یہ اردو ڈکشنری بورڈ اور عبدالحق کی 'لغت کبیر' اس کا ہی ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس میں ایک پوری تہذیب لفظ بہ لفظ محفوظ کر دی گئی ہے۔

فعل متعدی ایسا فعل ہے، جس کے لیے مفعول کی ضرورت ہوتی ہے جو فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچے، جیسے پانا، دینا... یا اس ادارے کے وجود کو منظور کرنا! چند اور لوگوں کو بھی سیکھنا چاہیے۔ کم از کم ان اداروں کو چلانے کے قابل افرادی قوت تو میسر ہو سکے۔ اردو کے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تو بے شک کمی نہیں ہے لیکن اس زبان کے عالم، اسکالر، اب ڈھونڈے نہیں ملتے... وہ اب ختم ہو چکے ہیں، چند بوڑھوں کے علاوہ (تعداد میں چار یا پانچ) نئی نسل سے اردو کے جامع اسکالر غائب ہیں، وقت کا یہ کتنا سنگین مذاق ہے؟

•••

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org